شیخ اعجاز احمد کی جمع کردہ بیاضِ اقبال

ڈاکٹر سعید اختر دُرّانی

تاریخی اہمیت کی حامل یہ بیاضِ اقبال جو آپ کے پیشِ نظر ہے، اس کے پس منظر کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس داستان کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ جب میں اوائل ۱۹۸۷ء میں اقبال اکیڈمی برطانیہ کا صدر منتخب ہوا تو میں نے ایک منصوبہ (یعنی project) یہ شروع کیا کہ ہر ایک ایسے شخص کا انٹرویو ریکارڈ کر لیا جائے جو علامہ سے مل چکا ہو۔ اس لیے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ایسے لوگ دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں اور کوئی دن جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ۱۹۸۷ء سے تا امروز علامہ کے بارے میں جن اشخاص کے انٹرویو میں نے audio cassettes پر ریکارڈ کیے ہیں، ان میں مندرجہ ذیل صاحبان شامل ہیں: م ش (صحافی، محمد شفیع)، سیّد امجد علی، ڈاکٹر حمید اللہ، میر یاسین علی خان، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، جناب مختار مسعود، حکیم غلام نبی، جناب احمد ندیم قاسمی، محترمہ حجاب امتیاز علی، ڈاکٹر جاوید اقبال، محترمہ منیرہ بیگم اور محترمہ بیگم آفتاب اقبال (اگر چہ وہ خود علامہ سے نہ ملی تھیں)۔

برسرِ تذکرہ، میں نے اپنے ایک عراقی طالب علم ڈاکٹر سعدی النجار کو ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ، جب وہ برلن کا دورہ کر رہے تھے، اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ علامہ کی سابقہ گورنس محترمہ ڈورس احمد کا انٹرویو ریکارڈ کر لیں۔ لیکن مسز احمد نے کہا کہ وہ ایسے تمام حالات پر ایک مکمل انٹرویو ریڈیو پاکستان کے لیے پہلے ہی ریکارڈ کر چکی ہیں۔ اسی طرح میں نے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے درخواست کی کہ وہ جناب محمد عبداللہ قریشی کا لاہور میں انٹرویو ریکارڈ کر لیں۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ ایسا کر چکے ہیں۔

میرا اب ارادہ یہ ہے کہ یہ تمام انٹرویو transcribe کر کے شائع کر ڈالوں اور سارے اصل کیسٹ اقبال اکادمی پاکستان کے ذخیرے (Archives) میں جمع کر دوں۔ واللہ المستعان۔

بہرصورت، مذکورہ بالا منصوبے ہی کے تحت میں نے فیصلہ کیا کہ علامہ کے مُسن برادر زادے جناب شیخ اعجاز احمد کے ساتھ ایک مصاحبہ بھی ریکارڈ کر لیا جائے جن کے بارے میں مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ

۱۹۹۰ء کے عشرے میں وہ تاحال حینِ حیات تھے، اگرچہ اُن کا سن نوّے سال سے تجاوز کر چکا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء کے دوران میں میرا دو مرتبہ پاکستان جانا ہوا۔ اوائل جنوری ۱۹۹۲ء میں، میں فزکس کی ایک عالمی کانفرنس گومل یونی ورسٹی میں شرکت کے لیے پاکستان گیا۔ واپسی پر کراچی میں رُکا، اور اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر خالد محمود دُرّانی کے یہاں ٹھہرا جو ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی میں پلاسٹک سرجری کے پروفیسر تھے۔ میرا قیام صرف ایک روز کا تھا یعنی بروز ۲۱/جنوری ۱۹۹۲ء اور میرا ایک ہی بڑا مقصد تھا، شیخ اعجاز احمد صاحب کے ساتھ ایک مفصل انٹرویو ریکارڈ کرنا جس کے لیے میں نے اپنے بھائی خالد سے کہہ رکھا تھا۔

شیخ صاحب کے یہاں ہم خالد میاں کی کار میں سہ پہر کے پانچ بجے پہنچے۔ PECHS میں واقع ان کی کوٹھی بڑی خوش وضع اور آراستہ، پیراستہ تھی۔ شیخ صاحب کے ساتھ فون پر بات ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ ہمارے منتظر تھے اور بڑی خوش خلقی کے ساتھ انھوں نے ہمارا استقبال کیا۔ جلد ہی اُن کا ملازم چائے اور پرتکلف لوازمات لے کر آیا۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ باوجود اس قدر کہنہ عمری کے (چند روز پیشتر اُن کی ۹۳ ویں سالگرہ واقع ہوئی تھی) وہ ماشاء اللہ کافی چاق و چوبند تھے۔ چہرے پر رونق، چھوٹی سی سفید ڈاڑھی اور حافظہ بالکل صاف شفاف، صرف چلنے پھرنے میں دقت تھی اور انھیں بیساکھی کے سہارے چلنا پڑتا تھا۔ وہ باقاعدگی کے ساتھ نماز بھی ادا کرتے تھے۔

میں نے انھیں بتایا کہ مجھے علامہ اقبال کے کلام و پیام کے علاوہ اُن کی زندگی کے واقعات کے ساتھ بہت دلچسپی ہے اور چنانچہ چند سال قبل اقبال اکادمی پاکستان سے میری کتاب اقبال یورپ میں چھپ چکی ہے (۱۹۸۵ء)۔ اس کا ایک نسخہ بھی (جو دراصل خالد کی ملکیت تھا) میں نے اُن کو پیش کیا۔ شیخ صاحب نے بھی ازراہِ کرم مجھے اپنی کتاب مظلوم اقبال عاریتاً عطا کی۔ (یہ بھی اتفاق سے ۱۹۸۵ء ہی میں چھپی تھی)۔ اُس وقت اُن کے پاس اس کی ایک ہی کاپی تھی۔ خالد نے چند دن بعد اس کی مکمل فوٹو کاپی تیار کر کے مجھے برمنگھم بھیج دی اور اصل نسخہ شیخ صاحب قبلہ کو لوٹا دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد شیخ صاحب نے کتاب کا ایک اور نسخہ خالد کو عطا کیا جو مؤخر الذکر نے ڈاک سے مجھے بھیج دیا۔ شیخ صاحب نے خالد کو یہ بھی بتایا کہ اس عرصے میں انھوں نے میری مذکورۂ بالا کتاب بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھ لی تھی۔

بات جنوری ۱۹۹۲ء کی ملاقات کی ہو رہی تھی۔ میں نے شیخ اعجاز احمد صاحب سے علامہ کی زندگی کے بارے میں بہت سے سوالات کیے جن کے انھوں نے مفصل جوابات دیے اور یہ سب میں نے ریکارڈ کر لیے۔ یہ بالکل عیاں تھا کہ انھیں اپنے مرحوم چچا، علامہ اقبال کے ساتھ بے حد محبت اور عقیدت تھی۔ کئی بار علامہ کے بارے میں کوئی بات کہتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور اُن کی آواز بھرا جاتی۔ اُن کو حضرت علامہ کا بہت سا کلام بھی ازبر تھا اور یہ بھی میں نے ان کی زبانی ریکارڈ کر لیا۔ اس مصاحبے کے دوران شیخ صاحب کے کچھ افرادِ خانہ بھی وقتاً فوقتاً شریکِ محفل ہوئے۔ اس مصاحبے کے

دوران میں نے شیخ صاحب سے پوچھا، کیا علامہ اقبال کے کلام کی وہ قلمی بیاض اب بھی اُن کے پاس موجود ہے (جس کا ذکر روز گارِ فقیر میں ملتا ہے) اور اگر ہے تو کیا میں اُسے دیکھ سکتا ہوں؟ شیخ صاحب نے فرمایا، ہاں وہ میرے پاس موجود ہے لیکن وہ کاغذات میں تلاش کرنی پڑے گی۔ کسی اور موقعے پر میں وہ آپ کو ضرور دکھاؤں گا۔ یہ معاملہ اُس وقت میں نے اسی مرحلے پر چھوڑ دیا۔

یہ تمام گفتگو تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ اُس وقت شام کے سات بج رہے تھے (میری ۱۹۹۲ء کی ڈائری کے مطابق جس میں، میں نے چند بہت مختصر اندراجات ثبت کیے تھے، وہاں سے ۷/ بجے رخصت ہو کر خالد اور میں کچھ دیر کے لیے ساحلِ بحر پر چہل قدمی کے لیے گئے)۔ مصاحبے کے دوران میں ہم نے شیخ صاحب کی کچھ تصاویر بھی کھینچیں۔ جب ہم نے اُن سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو شیخ صاحب از راہِ کرم بیساکھیوں کا سہارا لیتے ہوئے ہم کو دروازے تک چھوڑنے کے لیے آئے۔ ہم نے اُن سے بہت کہا کہ آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں، ہم خود ہی آسانی سے باہر جا سکتے ہیں لیکن شیخ صاحب نے فرمایا: ''نہیں، مہمان کی دروازے تک مشایعت سنتِ رسول کریمؐ ہے۔'' ہم اُن کے اس اسلامی جذبے اور شعائرِ اسلام کی اس درجہ پیروی سے بے حد متاثر ہوئے اور اس کے بعد میں بھی اس سنت پر پہلے سے زیادہ استقامت کے ساتھ کار بند رہا ہوں۔ اگلی صبح ساڑھے چھ بجے کی فلائٹ سے میں واپس لندن روانہ ہو گیا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ چند ہی ماہ بعد شیخ اعجاز احمد صاحب سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی، یعنی بروز ۲۴/ستمبر ۱۹۹۲ء۔ ستمبر ۱۹۹۲ء میں بیجنگ میں 'جوہری نقوش' (Nuclear Tracks) کی ایک کانفرنس میں 'جوہری نقوش' شرکت کے بعد، جاپان سے ہوتا ہوا براہِ منیلا و بنکاک بدھ ۲۳/ستمبر ۱۹۹۲ء کو صبح کے ساڑھے تین بجے کراچی پہنچا اور ہالیڈے اِن ہوٹل میں تھوڑی بہت نیند پوری کرنے کے بعد سائنسی اداروں اور تجربہ گاہوں کے معائنے میں مصروف ہو گیا، جہاں سب سے اہم ملاقات پروفیسر سلیم الزماں صدیقی صاحب سے ہوئی جو تقریباً نوے سال کی عمر میں بھی کم و بیش ہر روز اپنے کیمیائی معمل میں تشریف لاتے تھے۔ کراچی میں میرا قیام بس دو دن کا تھا اور یہ دونوں دن بے حد مصروف گزرے۔ اس دوران میری سب سے اہم ملاقات شیخ اعجاز احمد کے ساتھ تھی جس کے لیے جمعرات ۲۴/ستمبر ۱۹۹۲ء کو سہ پہر کے ساڑھے تین سے پانچ بجے کا وقت طے ہوا تھا۔ جب میں شیخ صاحب کے دولت خانے پر پہنچا تو وہ دوبارہ بکمالِ شفقت میرے ساتھ پیش آئے اور میرے بھائی کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ خالد نے اُن کی تمام چیزیں بحفاظت مجھے پہنچا دی تھیں، جن میں سے بالخصوص میں نے اُن کی کتاب مظلوم اقبال بڑے شوق اور توجہ سے پڑھی تھی۔ میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ خالد ان دنوں امریکا میں تھے اس لیے وہ میرے ساتھ نہیں آ سکتے تھے۔ شیخ صاحب نے فرمایا کہ انھوں نے بھی میری کتاب اقبال یورپ میں بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی تھی۔ شیخ صاحب کی صحت اب بھی ماشاء اللہ ان کی عمر کے لحاظ سے بہت اچھی تھی۔ جب میں نے اس امر پر اظہارِ خوشی کیا تو فرمانے لگے (یا ہو سکتا ہے کہ یہ بات انھوں نے ہماری جنوری ۹۲ء

کی ملاقات میں کی ہو) کہ چونکہ میری پیدایش (۱۲) جنوری ۱۸۹۹ء کی ہے اس لیے مجھے خوب یاد رہتا ہے کہ میں کس سال کے دوران کس عمر کا ہوں، مثلاً ۱۹۸۰ء کے دوران میں اکیاسی برس کا رہا، بلکہ جب میری سالگرہ آتی ہے تو اُس سے ایک روز پیشتر میں سب نوکروں کو اُس تعداد میں روپے تحفۃً دیتا ہوں جو میں نے پورے کر لیے، مثلاً جنوری ۱۹۹۲ء میں، میں نے ۹۲ سال پورے کیے تو سب ملازموں میں، میں نے بانوے بانوے روپے بانٹ دیے جس سے وہ بہت خوش ہوئے (اُن دنوں یہ رقم خاصی وقیع ہوتی تھی)۔

اب کے میں نے دوبارہ اُن کی گفتگو ٹیپ ریکارڈ پر چڑھا دی اور کچھ اور تصویریں بھی کھینچیں پھر دورانِ گفتگو میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کی اُس بیاضِ اقبال کا کیا ہوا، کیا آپ کو مل گئی ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہاں، بالکل بلکہ آپ کے آنے سے پہلے میں نے اُسے الماری میں سے نکال کر آپ کو دکھانے کے لیے الگ رکھ دیا ہے۔ اس پر میں نے بہت اظہارِ امتنان کیا جس کے بعد شیخ صاحب نے یہ تاریخی کتاب مجھے دکھائی۔ میں نے بڑے شوق سے اس بیاض کی ورق گردانی کی اور کچھ دیر اس کے بارے میں اظہارِ خیالات کیا۔ پھر میں نے شیخ صاحب قبلہ سے پوچھا کہ یہ فرمائیے کہ اس بیاض کے مستقبل کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟ کیا آپ یہ تاریخی کتاب اپنے بچوں کو عطا کریں گے؟ شیخ صاحب نے فرمایا کہ بدقسمتی سے میرے بال بچوں کو علامہ اقبال کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ پھر آپ یہ اقبال اکادمی پاکستان کو عطا کر دیجیے، کہنے لگے: نہیں، وہ لوگ متعصب ہیں۔

یہاں شاید کچھ وضاحتی الفاظ مفید مطلب ہوں۔ ظاہر ہے کہ شیخ صاحب کا اشارہ ان کی احمدیت کی طرف تھا، جس کا سب لوگوں کو علم تھا۔ میری معلومات کے مطابق یہ امر تو بدیہی طور سے معلوم ہے کہ علامہ کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد صاحب، احمدیت کے مسلک پر قائم و دائم تھے (سیالکوٹ میں بیسویں صدی کے آغاز میں احمدیت کا کافی زور تھا اور سنا ہے کہ اقبال کے خاندان کے کچھ اور لوگ بھی اُس زمانے میں اس مسلک کی طرف کچھ رجحان رکھتے تھے)۔ بہرصورت جب میں چند ماہ پیشتر (جنوری ۱۹۹۲ء میں) شیخ اعجاز احمد صاحب سے ملا تھا تو دورانِ گفتگو انھوں نے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ وہ خود بھی راسخ العقیدہ احمدی ہیں اور اس بارے میں وہ کسی تلبیس و اِخفا کے قائل نہیں ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ جو شخص جس مذہب کا بھی پیرو ہو، چاہے وہ بدھ مت ہو یا عیسائیت یا دینِ زرتشتی اور اُس پر صدقِ دل سے کاربند ہو اور کسی سے اپنے اعتقاد کو نہ چھپائے تو ایسا شخص قابلِ تحسین ہے اور اس کی جرأت قابلِ داد ہے (قرآن مجید میں بھی ہے کہ لَکُم دِینکُمْ ولِیَ دین، اور مرزا غالب بھی فرما گئے ہیں کہ: وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے)۔ میں نے یہ بھی کہا کہ آج پاکستان میں احمدیت پر کافی کڑا وقت آن پڑا ہے، چنانچہ آپ کی جرأتِ اظہار میری نظر میں کافی قابلِ قدر ہے اور میرے یہ جذبات اخلاص پر مبنی تھے۔ ظاہر ہے کہ میرے یہ خیالات سن کر شیخ صاحب کو خوشی ہوئی ہوگی اور غالباً انھیں یہ گفتگو یاد بھی ہوگی۔

تو چنانچہ جب شیخ صاحب نے فرمایا کہ وہ اپنی بیاض اکادمی پاکستان کو عطا نہیں کرنا چاہتے کہ ''وہ لوگ متعصب ہیں'' (اگرچہ مجھے یہ علم نہیں کہ شیخ صاحب کا یہ خیال کیوں تھا) تو میں نے عرض کیا کہ اُس صورت میں یہ بے بہا کتاب آپ اقبال اکیڈیمی (یو کے) کو، جس کا میں صدر نشین ہوں، عطا کر دیجیے، 'کہ ہم لوگ تو متعصب نہیں ہیں!'۔ اس پر شیخ اعجاز احمد نے فی الفور فرمایا: ہاں، یہ بڑا اچھا خیال ہے اور یوں یہ بوجھ بھی میرے شانوں سے اُتر جائے گا۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ ''شیخ صاحب، اُس صورت میں آپ اپنے ہاتھ سے اس کتاب میں یہ تحریر کر دیجیے کہ آپ نے یہ کتاب اپنی خوشی سے مجھے، یعنی سعید اختر دُرّانی کو عطا کی ہے تا کہ ایک روز میں اس کی تہذیب و ترصیع کر کے اس کو شائع کر دوں اور یوں یہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہو جائے اور شائقینِ اقبال تک پہنچ جائے۔ ورنہ لوگ یہ نہ کہیں کہ اس کتاب کے کہن سال مالک کی آنکھ بچا کر دُرّانی صاحب اسے لے اُڑے ہیں۔'' شیخ صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو میں بخوشی یہ تحریر کتاب میں ثبت کر دیتا ہوں۔ چنانچہ قارئین! آپ اس مضمون کے ساتھ شائع ہونے والا عکس دیکھ سکتے ہیں کہ شیخ صاحب نے اپنے دستِ رعشہ دار سے کتاب کے ایک ابتدائی صفحے پر لکھ دیا ہے کہ ''یہ کتاب ڈاکٹر سعید اختر صاحب دُرّانی کو دے رہا ہوں برائے برائے، شیرازہ بندی و اشاعت''۔ (یہاں اعجاز احمد صاحب نے لفظ ''برائے'' سہواً دوبارہ لکھ دیا ہے) اس کے نیچے شیخ صاحب کے دستخط ہیں: اعجاز احمد اور ان کے مقابل تاریخِ تحریر: ۲۴/۹/۹۲۔ تو قارئین! یہ ہے ماجرا اس کتاب کے مجھ تک پہنچنے کا۔

موضوع کو آگے بڑھانے سے پیشتر میں یہاں دو ایک باتیں درج کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

پہلی بات کا تعلق شیخ اعجاز احمد کی کتاب مظلوم اقبال سے ہے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ یہ کتاب ابھی ابھی بعد از تلاشِ بسیار میرے ذخیرۂ کتب کے ایک دور دراز گوشے سے برآمد ہوگئی ہے۔ یہ وہ مطبوعہ نسخہ ہے (سنہ اشاعت، ۱۹۸۵ء، مطبع شیخ شوکت علی پرنٹرز، کراچی) جو شیخ صاحب نے میرے بھائی پروفیسر خالد محمود دُرّانی کے ہاتھ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، مجھے موسمِ بہار ۱۹۹۲ء میں بھجوایا تھا۔ یہ میں نے پچھلے دو روز میں (۲۷، ۲۸ رمئی ۲۰۰۵ء) از سرِ نو تمام و کمال پڑھ لیا ہے (اگرچہ اس کتاب کا فوٹو کاپی شدہ نسخہ جو خالد نے مجھے بھجوایا تھا، میں اوائل ۱۹۹۲ء ہی میں پڑھ چکا تھا)۔ پہلی بات جو اس کتاب کے مطالعے سے اُجاگر ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ امر بہت قرینِ قیاس ہے کہ علامہ کے بارے میں میرے کچھ مضامین مظلوم اقبال کی اشاعت سے پیشتر شیخ صاحب موصوف کی نظر سے گزر چکے تھے (اگرچہ انھوں نے اپنی کتاب میں براہِ راست میرے نام کا ذکر نہیں کیا) مثلاً اقبال کی تاریخِ ولادت کے بارے میں میری تحقیقات جو روزنامہ جنگ، لندن میں جنوری و ستمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اسی طرح اقبال اور ایما ویگے ناسٹ کے تعلقات اور اقبال کے خطوط بنام مس ویگے ناسٹ جو میں نے ۱۹۸۳ء میں ماہنامہ افکار کراچی میں شائع کیے تھے۔ ان دونوں موضوعات کے حوالے شیخ صاحب کی کتاب میں موجود ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کتاب کے مطالعۂ ثانی کے دوران میں نے دیکھا ہے کہ شیخ صاحب نے اپنے اور اپنے والدِ محترم شیخ عطا محمد صاحب کے احمدیہ عقائد کے بارے میں اس کتاب کے اندر بڑی تفصیل کے ساتھ اور کسی اخفا کے بغیر لکھا ہے اور یہ کتاب میں شیخ صاحب کے ساتھ دوسری ملاقات سے پیشتر ہی پڑھ چکا تھا۔ چنانچہ مجھے گمان گزرتا ہے کہ شاید میں نے اسی مؤخر الذکر ملاقات (یعنی بروز ۲۴ ستمبر ۱۹۹۲ء) کے دوران ہی میں انھیں اس بات پر مبارک باد دی ہو کہ وہ حالاتِ موجودہ میں اپنے عقیدے کا کھلے بندوں اعلان/اقرار کر کے بڑی جرأت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ اسی لیے شیخ صاحب نے اس آخری ملاقات میں اپنی عزیز اور بے بہا بیاض مجھے عطا کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔

خیر، اُس روز یہ ملاقات سہ پہر کے پانچ بجے کے لگ بھگ اختتام کو پہنچی اور یہ میری شیخ صاحب کے ساتھ آخری ملاقات ثابت ہوئی، چونکہ چند ماہ بعد مجھے اطلاع ملی کہ اُن کا انتقال ہوگیا ہے (انّا اللّٰہ و انا الیہ راجعون)۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مشیتِ ایزدی کا ایک حصّہ تھا کہ خدائی تعالیٰ نے انھیں زندہ رکھا تا آنکہ علامہ کی یہ بے مثال یادگار اِس ناچیز کی وساطت سے محفوظ ہاتھوں تک پہنچ جائے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میں نے شیخ صاحب کا صدقِ دل سے شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے مجھے اپنی متاعِ عزیز کے تحویل کرنے کے لیے مناسب اور قابلِ اعتماد شخص گردانا ہے اور یہ بھی کہا کہ میری یہ کوشش ہوگی کہ ایک روز میں اپنی اِس ذمہ داری سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوسکوں۔ واللہ المستعان۔

بہرصورت، جب میں شیخ صاحب کے یہاں سے رخصت ہوا (اور دوبارہ وہ میری مشایعت کے لیے دروازے کے باہر تک تشریف لائے) تو اُسی شام ساڑھے پانچ بجے کے قریب پاکستان آرٹس کونسل کراچی میں مجھے ایک ادبی تقریب میں شامل ہونا تھا، جہاں شفیع عقیل صاحب کی ایک کتاب کی رسمِ اجرا طے پا رہی تھی۔ وہاں جناب جمیل الدین عالی، جناب مشتاق احمد یوسفی اور جناب شان الحق حقی بھی شریکِ محفل تھے۔ جب میں نے ان اصحاب سے علامہ اقبال کی بیاض کا قصّہ بیان کیا تو ایک صاحب (غالباً عالی جی) نے فرمایا کہ حضرت! ہم یہاں کراچی میں چالیس سال سے بیٹھے ہوئے ہیں لیکن ہمیں یہ بے بہا تحفہ نصیب نہیں ہوا تو آپ کیسے ایک روز کے لیے یہاں تشریف لائے اور ایسی نادرۂ روزگار چیز لے کر چل دیے؟ میں نے عرض کیا: یہ ہے فائدہ 'متعصب نہ ہونے کا'۔ ان سب نے بیاض کے ورق اُلٹ پلٹ کے دیکھے اور میں نے خدا کا شکر کیا کہ اس کے صفحۂ اوّل پر شیخ اعجاز احمد صاحب نے بقلمِ خود تحریر کر دیا تھا کہ وہ یہ کتاب مجھے شیرازہ بندی اور اشاعت کے لیے عطا کر رہے ہیں ورنہ ہوسکتا ہے کہ وہ اصحاب بھی یہ خیال کرتے کہ میں نے یہ بیاض نظر بچا کے اُڑا لی ہے (اُسی شام جناب جمیل الدین عالی نے مجھے اپنے دولت خانے پر رات کے کھانے کے لیے مدعو کیا تو جناب مشفق خواجہ مرحوم بھی تشریف لائے اور یہ شہرۂ آفاق مخطوطہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے)۔

اگلی صبح دس بجے (جمعہ ۲۵/ستمبر ۱۹۹۲ء) میں واپس انگلستان روانہ ہوگیا اور یوں یہ دورۂ پاکستان، چین و جاپان جو ایک ماہ پر محیط رہا تھا، ایک نعمتِ غیر مترقبہ کے حصول پر اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد پچھلے بارہ تیرہ سال سے یہ بیاض میرے کتب خانے میں محفوظ تو رہی لیکن مجھے قبلہ شیخ صاحب کے ساتھ کیا ہوا اپنا وعدہ وفا کرنے کا موقع میسر نہیں آسکا۔ چنانچہ میں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ 'انیس، دم کا بھروسا نہیں' یہ چراغ کب تک (تہِ داماں ہی سہی) لیے لیے پھرو گے؟ مجھے اقبال اکادمی پاکستان سے بہتر کوئی ادارہ نظر نہیں آتا، جو اس نادر بیاض کو اپنی حفاظت میں بھی رکھے (کہ ہماری اقبال اکادمی برطانیہ نے اور خود میں نے اپنے جمع کیے ہوئے بہت سے نوادراتِ اقبال، پچھلے چند سال کے دوران انھی کے محافظ (archives) کو تفویض کیے ہیں) اور علاوہ ازیں باقاعدہ شیرازہ بندی اور تنظیم و تہذیب کے بعد اس کو مطبوعہ صورت میں (یعنی بطور facsimile) اور ہو سکے تو میری اس پیش گفتار کے ساتھ، شائع بھی کر دے تاکہ مداحین و محققینِ اقبال کی اس تک بآسانی رسائی ہو سکے اور یوں اقبال اکادمی پاکستان کے یہاں سے اس بیاض کی اشاعت اُن کے متعصب نہ ہونے کا بدیہی ثبوت بھی ہوگا، شیخ صاحب کے خوف کے علی الرغم۔ (ہاں، میں نے اُن کی کتاب مظلوم اقبال سے دریافت کیا ہے کہ علامہ کے بیشتر باقیات انھوں نے پاکستان نیشنل میوزیم کراچی کی حفاظت میں رکھوا دیے تھے۔ تو چلیے علامہ کی ایک اور نشانی اقبال اکادمی پاکستان کے لاہور کے ذخیرے میں بھی سہی!)

پیشتر اس کے کہ میں اس بیاض کو describe کروں یعنی اس کے احوالِ طبیعی بیان کروں، شاید یہ امر قارئین کے لیے فائدہ مند ہو اگر میں فقیر سیّد وحید الدین کی قابلِ قدر کتاب روز گار فقیر جلد دوم (لائن آرٹ پریس کراچی، طبع دوم ۱۹۶۵ء طبع اوّل، ۱۹۶۴ء) میں سے شیخ اعجاز احمد کی اس بیاض کی genesis (تولید) کے بارے میں کچھ پیراگراف نقل کروں۔ صاحب روز گار فرماتے ہیں: (صفحات ۲۱۵ تا ۲۱۷)

> شیخ اعجاز احمد کو لڑکپن ہی سے علامہ اقبال کے کلام سے دلچسپی اور شغف رہا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں جب علامہ نے اپنی شہرۂ آفاق نظم 'شکوہ' حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی تو شیخ صاحب سیالکوٹ سے علامہ کے والدِ بزرگوار کے ہمراہ لاہور آ گئے اور اس اجلاس میں علامہ کی زبان سے اُن کی نظم سنی۔ شیخ صاحب اُن دنوں آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے اور اُن کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک کاپی میں مختلف رسالوں اور اخباروں سے علامہ کی نظمیں نقل کرنی شروع کیں۔ اُن کا یہ شوق ترقی کرتا گیا۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء میں جب وہ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے تو علامہ کا کلام جمع کرنے کے انھیں اور زیادہ مواقع میسر آئے۔ شیخ صاحب نے لاہور میں علامہ کی بہت سی نظمیں خود اُن کے کاغذوں سے نقل کی ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال انارکلی والے بازار میں رہتے تھے۔ شیخ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ میں خاصا بدخط ہوں۔ اس لیے میری خواہش تھی کہ چچا جان کا سارا کلام ایک خوب صورت بیاض میں خوش خط لکھوا کر رکھوں۔ اس خواہش کی تکمیل کا سامان ۱۹۱۹ء میں یوں ہوا کہ میرے ایک ہم وطن شاہ نواز

صاحب نے جو شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے، میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کا امتحان دے کر سیالکوٹ میں مطب شروع کیا۔ میں بی اے کا امتحان دے کر سیالکوٹ آیا تو اُن کے مطب میں چونکہ مریض ابھی زیادہ نہیں آتے تھے، لہٰذا شعر و شاعری کا چرچا رہتا۔ ڈاکٹر شاہ نواز صاحب بڑے خوش خط تھے۔ انھیں میری خواہش کا علم ہوا تو بڑے شوق اور بڑے اصرار سے کتابت کا کام اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ موجودہ بیاض بڑے اہتمام سے تیار کرائی گئی اور ڈاکٹر شاہ نواز صاحب نے میری کاپی سے چچا جان کا کلام بیاض میں نقل کرنا شروع کر دیا۔ کاپی میں تو یہ سب کلام بے ترتیب لکھا ہوا تھا۔ بیاض کے لیے طے پایا کہ پہلے اُردو غزلیات، اُن کے بعد فارسی کلام جو بہت زیادہ نہ تھا، اُس کے بعد وہ کلام جو اکبر الٰہ آبادی مرحوم کے رنگ میں تھا اور سب سے آخر میں نظمیں درج کی جائیں۔ چنانچہ ہر روز میں اور ڈاکٹر شاہ نواز بہت سا وقت اس کام میں صرف کرتے۔ جب میں لا کالج میں داخلہ لینے کے لیے لاہور جانے لگا، اُس وقت تک غزلیات، فارسی کلام اور اکبری اقبال کا بہت سا حصّہ بیاض میں نقل ہو چکا تھا لیکن ابھی بہت سا کلام باقی تھا جس کو شاہ نواز صاحب نقل نہ کر سکے کیوں کہ جب میں دوبارہ کالج کی چھٹیوں میں سیالکوٹ آیا تو ڈاکٹر صاحب کا کام چل نکلا تھا اور انھیں اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ اس کام کو جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ باقی کلام میں نے خود اپنے قلم سے اس بیاض میں منتقل کیا۔ لا کالج کے زمانے میں بھی گاہے گاہے چچا جان کی میز پر سے اُن کا تازہ کلام نقل کرنے کا موقع مل جاتا۔

تو یہ ہے سیّد وحید الدین اور خود شیخ اعجاز احمد صاحب کے الفاظ میں اس بیاض کی تدوین و تخلیق کا پس منظر۔ اب میں بیاض کی طبیعی description کی طرف آتا ہوں۔ یہ قریب ۷ انچ × ساڑھے چار انچ (یعنی قریب ۱۸× ساڑھے گیارہ سنٹی میٹر) کی تقطیع کی کتاب ہے۔ بیاض کے کل صفحات قریب ۷۳۲ ہیں جن میں سے آخر کے ۳۳۰ اور یہاں وہاں بیچ کے ۴۱ صفحات خالی ہیں (یعنی کل کورے صفحات ۳۷۱ ہیں) جن صفحات پر تحریر موجود ہے وہ کل ملا کر ۳۶۱ ہیں، یعنی کتاب کا قریب نصف حصّہ خالی ہے اور نصف مرقوم ہے۔ بیاض کے تمام صفحات کافی خستہ حالت میں ہیں، کہنگی کی بدولت پیلے پڑ چکے ہیں اور ان کے کنارے جھڑ رہے ہیں۔ بہت سے ورق جلد سے اُکھڑ چکے ہیں اور شیرازہ بندی کے متقاضی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پوری بیاض کے گرد ایک ایسی جلد مڑھ دی گئی ہے (یعنی یہ بیاض ایسے covers کے درمیان مقبوض یا منضبط کر دی گئی ہے) جو ایک کہن سال انجیلِ مقدس کی جلد ہوا کرتی تھی (پشت والے cover پر اب بھی Old Testament یعنی عہد نامہ عتیق کے الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں)۔ یہ سیاہ رنگ کی جلد کافی دبیز اور مضبوط ہے اور اسی وجہ سے چنی گئی ہوگی۔

جیسا کہ شیخ اعجاز احمد مرحوم نے روز گار فقیر کے محولہ بالا اقتباسات میں فرمایا، بیاض کا حصّہ اوّل بڑی خوش خط تحریر میں ہے۔ پہلے پانچ صفحے جن پر نمبر شمار تحریر نہیں ہیں، ابتدائیہ یا تعارفی اوراق ہیں۔ صفحۂ اوّل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتا ہے جس کے نیچے (ڈاکٹر شاہ نواز کے خط میں) تحریر ہے:

از خدا آغاز کردم، با خدا انجام باد۔ دوسرے صفحے پر ھُوالشعر اور اس کے نیچے لکھا ہے: خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے/ تب نظر آتی ہے اِک مصرعِ تر کی صورت۔ تیسرے صفحے پر تحریر ہے: اِنّ من الشعر لحکمته و اِنّ من البیان لسَحراً۔ اور اُس کے نیچے: کہہ گئے ہیں شاعری 'جزویست از پیغمبری'۔ چوتھے صفحے پر ہم اس کتاب کا 'انتساب' دیکھتے ہیں جو یوں ہے: اقبال، یعنی مجموعۂ کلامِ بلاغت انضمام، چکیدۂ کلک جواہر سلک، حقیقت طراز، صاحب اعجاز، ناظم مملکت سخن وری، پیغمبرِ فنِ شاعری، مایۂ نازشِ قوم، لسان التوحید والاسلام۔ ترجمانِ حقیقت، فخر الملک علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب، ایم اے، پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا (سیالکوٹی) اور اس کے نیچے: جامع: اعجاز۔ اقبال منزل سیالکوٹ شہر۔ ۱۹۱۹ء مطابق ۱۳۳۷ھ۔ پانچویں صفحے پر صرف 'فہرست' کا لفظ نظر آتا ہے (خوش خط) اور اس کے بعد چھٹے صفحے پر صرف ایک صفحے کی فہرستِ مطالب ہے جو بیاض کے صفحات ۱ تا ۱۹ سے متعلق ہے۔ یعنی:

صفحہ	عنوان	مصرعِ اوّل
۱	غزل	انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
...	.....	....
...	.....	....
...	.....	....
۱۷	غزل (ناتمام)	کل ایک شوریدہ خوابگاہِ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
...	.....	....
۱۹	غزل	جھلک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں

یہ فہرست بدخطی کی مظہر ہے، جو ظاہر ہے کہ شیخ صاحب کی تحریر کردہ ہے۔ اس صفحے کے بعد ۱۹ صفحات کورے ہیں اور بغیر نمبر ہائے شمار کے جن پر شیخ صاحب بیاض کے بقیہ مطالب درج کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے مگر بوجوہ ایسا نہ کر سکے۔ بیسویں صفحے پر حصّۂ آغاز کا عنوان 'غزلیات' خوش نویسی سے ثبت ہے۔ یہاں سے آگے تمام صفحات پر اردو ہندسوں میں تا آخرِ کتاب صفحوں کے نمبر شمار درج ہیں۔ اردو ہندسوں والے آخری صفحے کا نمبر ۳۵۸ ہے۔ اس کے بعد کے اٹھارہ صفحوں پر انگریزی ہندسے دیے گئے ہیں جن میں آخری نمبر ۳۷۶ ہے۔

حصّہ اوّل میں صفحہ ۱ سے (انوکھی وضع ہے....الخ) صفحہ ۷۰ تک اردو غزلیات ہیں۔ (ص ۷۰ کی آخری غزل کا عنوان ہے: برائے مشاعرہ بھوپال منعقدہ ۱۸/اگست ۱۹۱۰ء شعر:

حلقہ زنجیر کا ہر جوہرِ پنہاں نکلا
آئنہ قیس کی تصویر کا زنداں نکلا

(لیکن اس کافی پرانے اور رسمیہ انداز کی غزل کے صرف تین شعر یہاں درج ہیں)۔ علامہ کی یہ اردو غزلیات شاہ نواز صاحب کے بڑے خوب صورت خط میں تحریر ہیں پھر اگلے چھ صفحوں پر یعنی ۷۱ تا ۷۷ (ص ۷۶ خالی ہے) شیخ صاحب کی 'بدخط تحریر' میں علامہ کا کچھ اور اردو کلام درج ہے۔ پھر اس کے آگے کے ۱۳ صفحات خالی ہیں (۷۸ تا ۹۰)۔ جن کے بعد شاہ نواز صاحب کی خوش خط تحریر میں ص ۹۱ پر 'فارسی کلام' کا عنوان ہے (ص ۹۲ پر شیخ صاحب نے معارف سے چار شعر نقل کیے ہیں) مگر اس حصے میں شاہ نواز صاحب کی خوش نویسی صرف دس صفحات پر محیط ہے (۹۳ تا ۱۰۲۔ اور آخری صفحے پر بھی اُن کی تحریر میں صرف دو شعر درج ہیں) جس کے بعد پھر باقی تمام کتاب شیخ اعجاز احمد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے یعنی ص ۱۰۲ سے ۱۱۳ (تمام فارسی) ص ۱۱۵ سے ۱۲۵ (اردو) ص ۱۲۶ سے ۱۴۱ (فارسی)۔ ص ۱۴۲ تا ۱۵۰ خالی ہیں۔ اور اس کے بعد ص ۱۵۳ سے تا آخرِ کتاب یعنی تا ص ۳۷۶، سب کا سب مواد شیخ صاحب موصوف کے ہاتھ کا تحریر کیا ہوا ہے اور سب اردو میں ہے۔ سوائے مندرجہ ذیل چار صفحات کے جو شاہ نواز صاحب کی تحریر میں ہیں یعنی 'اوّل' ص ۱۱۱ جو صفحہ عنوان ہے اور جس پر لکھا ہے: ''اکبری اقبال۔ یعنی (اشعار مولینا اکبرالہ آبادی کے رنگ میں) ورباعیات''۔ یہ حصہ (جس میں پہلے اقبال کا اکبری طرز کا کلام ہے اور آخر میں مختلف رباعیات ہیں) صفحات ۱۱۲ تا ۱۲۵ پر محیط ہے۔ ان میں شاہ نواز صاحب کی تحریر میں صرف دو صفحات ہیں یعنی ص ۱۱۳ و ۱۱۴ (جنھیں میں نے اُن کے صفحات 'دوم وسوم' شمار کیا ہے) باقی تمام مندرجات مع اکبری اشعار (ص ۱۱۵ تا ۱۲۱) شیخ صاحب کے قلم سے ہیں جن کی کچھ تفصیل مع صفحات نمبر اوپر (یعنی چند سطور قبل) بیان ہو چکی ہے۔ شاہ نواز صاحب کی آخری تحریر ہمیں ص ۱۵۱ پر ملتی ہے (یعنی اُن کے مذکورہ بالا چار صفحات میں کا صفحۂ 'چہارم') اور وہ بھی صرف یک لفظی عنوان پر مشتمل ہے: 'منظومات'۔ اس کے بعد کے تمام صفحات (۱۵۳....الخ) شیخ صاحب کی اُردو تحریر میں ہیں۔

مندرجہ بالا اعداد وشمار کا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ نواز صاحب مرحوم کی خوش نویسی کل ۹۱ (اکانوے) صفحات پر محیط ہے یعنی بیاض کا ایک چوتھا حصہ اور بقیہ تمام صفحات (یعنی باقی ۲۶۹ یا ۲۷۰ صفحے) شیخ اعجاز احمد مرحوم کے خط میں ہیں۔ میزان کل قریب ۳۶۱ صفحات۔ ان میں فارسی کلام صرف ۳۵ صفحات پر محیط ہے اور باقی تمام ۳۲۶ صفحات پر اُردو کلام درج ہے۔ ہاں، اس ورق گردانی کے دوران یہ دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ اس گراں بہا بیاض کے دو ورق غائب ہیں (اندازاً صفحات نمبر ۲۳ تا ۲۶، چونکہ ان اوراق کے گردونواح میں بہت سے صفحات کے نمبر شمار مرورِ زمانہ سے جھڑ چکے ہیں)۔ یہ حصہ شاہ نواز صاحب کے رسم الخط میں ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ دو ورق کس زمانے میں گم ہوئے۔ خدا کرے کہ جب صاحبِ روزگارِ فقیر نے اس بیاض کے غیر مطبوعہ حصے اپنی کتاب میں نقل کیے تھے تو اُس وقت یہ اوراق بیاضِ مذکور میں موجود رہے ہوں، ورنہ اِناللہ و اِنا الیہ راجعون کہنے کے سوا چارہ نہیں۔

مذکورہ بالا descriptions اور اعداد و شمار تو ہوئے وہ کوائفِ طبیعی جن کا کچھ صفحات پہلے میں نے ذکر کیا تھا، اب اصل کام اس بیاض کے مندرجات کا تفصیلی جائزہ ہے کہ کون سے شعر کہاں شائع ہو چکے ہیں اور کون سے شعر پہلی مرتبہ روز گارِ فقیر (جلد دوم، ۱۹۶۴/۵ء) میں درج ہوئے یا کون سے اتفاقاً چھوٹ گئے (missed out)۔ اور یہ وہ کام ہے جو سراسر بقولِ ذوق 'جگر گدازی ہے، سینہ کاوی ہے، جاں کنی ہے'...اور جس کے لیے میری نظر میں سب سے زیادہ موزوں شخص میرے دوست اور کرم فرما جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ہیں جو کہ ایسے عمیق و ہمہ گیر مطالعات کے لیے مشہور ہیں (مثلاً دیکھیے اُن کی کتاب: تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ۔ اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۲ء) چنانچہ میں بہ کمال مسرت و اطمینان یہ کارِ جگر گداز اُن کے لائق ہاتھوں کے سپرد کرتا ہوں اور خود چند عمومی تاثرات (observations) پر اکتفا کرتا ہوں۔

پہلی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کا بہت سا ایسا کلام جو اُن کے authorized (یعنی بالاجازہ) چھپے ہوئے مجموعہ ہائے کلام (یا کلیات) میں شامل نہیں ہوا وہ اُن کی وفات سے پہلے اور زیادہ تر وفات کے بعد شائع ہونے والی کتابوں میں چھپ چکا ہے جن میں سے مندرجہ ذیل سب سے زیادہ اہم ہیں یعنی کلیاتِ اقبال مدوّنہ مولوی محمد عبدالرزاق (مطبوعہ عماد پریس، حیدر آباد دکن۔ ۱۳۴۳ھ) (مطابق ۱۹۲۴ء) باقیاتِ اقبال مرتبہ سیّد عبدالواحد معینی (مجلسِ اقبال، کراچی۔ ۱۹۵۳ء) سرودِ رفتہ مرتبہ غلام رسول مہر و صادق علی دلاوری (کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۹ء) رختِ سفر، مرتبہ محمد انور حارث (تاج کمپنی لاہور۔ ۱۹۵۲ء) اور آخر میں روز گارِ فقیر (جلد دوم) مصنفہ فقیر سیّد وحید الدین (لائن آرٹ پریس، کراچی۔ بارِ اوّل نومبر ۱۹۶۴ء۔ بارِ دوم اگست ۱۹۶۵ء) جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ ان تصنیفات و تالیفات میں سے یہاں انگلستان میں میرے پاس صرف دو کتابیں موجود ہیں یعنی کلیات مدوّنہ مولوی عبدالرزاق اور روز گارِ فقیر مصنفہ فقیر وحید الدین (اور یہ کمی بھی ایک مزید وجہ ہے کہ میں اس بیاض کا کوئی عمیق جائزہ لینے سے قاصر ہوں)۔ اس بیاض کا معائنہ کرنے سے فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ تقریباً ہر صفحے پر شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنے قلم سے اس قسم کے remarks درج کر دیے ہیں: ''سرودِ رفتہ، رختِ سفر (یا) کلیات (عبدالرزاق) میں موجود ہے'' یا یہ کہ ''بانگِ درا'' میں ہے۔ اغلب یہی ہے کہ شیخ صاحب نے یہ ریمارکس یا شذرے اُس انتخاب و تنقیح کی خاطر لکھے ہوں گے جب وہ سیّد وحید الدین کے لیے ایسے اشعار نشان زدہ کر رہے تھے جو پیشتر ازیں کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ عموماً ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ہر غزل یا نظم کے اوپر کچھ اس قسم کے اشارے درج کیے ہیں مثلاً بیاض کے ص ۲ پر درج غزل کے اوپر یہ نشان نظر آتے ہیں: ''✓ سرودِ رفتہ۔ o رختِ سفر۔ باقی اشعار بانگِ درا میں'' چنانچہ جو شعر بانگِ درا میں نہیں ہیں، اُن کے مقابل شیخ صاحب نے o یا ✓ یا o ✓ کے نشانات مرتسم کیے ہیں۔ مثلاً: o ✓ سَو سَو امید بندھتی ہے اک اک نگاہ پر ہم کو (رختِ سفر،

سرود مجھ کو) نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی' جو شعر علامہ کی authorized یعنی منظور کردہ یا اجازت دار کتابوں میں موجود ہیں اُن پر عموماً شیخ صاحب نے × کا نشان لگایا ہے۔ مثلاً ص ۱۲-۱۱ پر 'پیامِ عشق' کے عنوان کے تحت جو غزل ہے (سن اے طلب گارِ دردِ پہلو میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا) اُس کے اوپر یہ نشان ہے: ''× بانگِ درا میں ہے۔'' اور پھر اس غزل کے ہر شعر پر قطع کا نشان (×) لگایا ہے سوائے ذیل کے شعر کے:

دیارِ خاموشِ دل میں ایسا ستم کشِ دردِ جستجو ہو
کہ اپنے سینے میں آپ پوشیدہ صورتِ حرفِ راز ہو جا

اور واقعی یہ شعر بانگِ درا میں نہیں ہے۔ غزل کے نیچے درج ہے: مخزن۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء۔ اس سے اگلی چیز ایک نعمت ہے جس پر o کا نشان ہے اور لکھا ہے: ''رختِ سفر اور سرودِ رفتہ دونوں میں چھپ گئی ہے۔... نشان والا شعر دونوں میں نہیں۔'' یہ شعر نعت کا مطلع ہے:

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منھ کو چھپا چھپا کر

بہت سے مندرجات کے اوپر موٹی سرخ پنسل سے ✓ کا نشان ہے اور بعضوں کے اوپر موٹی سرخ پنسل سے × کا نشان ہے جو غالباً re-checking (جائزۂ مکرّر) کے دوران شمار کرنے کا پیرایہ ہے (اگرچہ سرسری نظر سے یہ عیاں نہیں ہوتا کہ اس نسبتاً نادر (rare) نشان × سے کیا مراد ہے)۔

بعض مندرجات کے اوپر شیخ صاحب نے تفصیلی شذرے لکھے ہیں، مثلاً غزل مندرجہ صفحات ۴ تا ۶ کے اوپر (علاوہ '' ✓ o رختِ سفر اور سرود میں ہے'' اور '' ✓ (بانگِ درا)'' جس پر موٹی سرخ پنسل کا نشان ہے) جناب شیخ صاحب نے تحریر کیا ہے:

> تقریباً آٹھ برس ہوئے (یہاں غالباً 'بارہ برس' ہونا چاہیے) اقبال نے یہ نظم یورپ کی مادّہ پرستی کے خراب اثرات دیکھ کر یورپ کے قیام ہی میں لکھی تھی۔ یہ سچ ہے کہ حقیقی شاعر تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے۔ جو کچھ ۸ برس پیشتر شاعر کے دماغ میں تھا، وہ آج ہو بہو پیش ہو رہا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ روحانیت کو مادّیت پر فتح ہوگی۔

اس کے نیچے وہ مشہور غزل شاہ نواز صاحب کے خط میں درج ہے یعنی 'زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا... الخ'، جس کے تحت شیخ صاحب نے لکھا ہے: ''مخزن مارچ ۱۹۰۷ء''۔ اس غزل کے صرف ایک شعر پر یہ نشان لگایا گیا ہے (o✓) یعنی: o✓ جنھوں نے میری زبانِ گویا کو محشرستاں صدا کا جانا، مرا وہ دل چیر کر جو دیکھیں تو واں سکوتِ مزار ہوگا۔ (یہاں 'مرا' کو 'میرا' لکھا گیا ہے اور اولاً اس میں 'ہزار' لکھا گیا تھا جس کو شیخ صاحب نے کاٹ کر اُس کے اوپر 'مزار' لکھ دیا ہے۔)

یہاں میں اس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ صاحبِ روزگارِ فقیر نے اس قسم کے شذرات جو مطبوعہ کتاب میں حذف کر دیے ہیں تو یہ بات کس قدر قابلِ تاسّف ہے کیوں کہ ایسے بعض شذروں میں کافی

دلچسپ یا کارآمد باتیں موجود ہیں۔ مثلاً مشہور نظم 'کوہستانِ ہمالہ' (ص ۲۱۵...الخ) کی پیشانی پر شیخ صاحب فرماتے ہیں: ''حضرتِ اقبال انگریزی خیالات کو شاعری کا جامہ پہنا کر ملک الشعرائے انگلستان ورڈس ورتھ کے رنگ میں کوہِ ہمالہ کو یوں مخاطب کرتے ہیں'' (اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں ....الخ)

برسرِ تذکرہ، صفحہ ۲۲۹ پر شیخ صاحب نے یہ عنوانات قائم کیے ہیں (اگرچہ یہ نظم روز گارِ فقیر میں مطبوعہ کلام کے ذیل میں نہیں آتی):

ہائیڈل برگ۔ ستمبر ۱۹۰۷ء

دریائے نیکر کے کنارے

ایک شام۔ خاموشی

اور نظم (خاموش ہے چاندنی قمر کی....الخ) کے نیچے بائیں جانب درج ہے:

''(ہمایوں مارچ ۲۲)'' اور دائیں جانب (بانگِ درا) یہ معلوم نہیں کہ ہمایوں میں نظم کے لکھے جانے کی تاریخ (یعنی ستمبر ۱۹۰۷ء) درج تھی یا نہیں؟ کم از کم بانگِ درا میں یہ تاریخ موجود نہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک کارآمد اضافہ ہے کیوں کہ اب کے علامہ کے خطوط بنام ایما ویگے ناست چھپ چکے ہیں (دیکھیے میری کتاب اقبال یورپ میں، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۵ء) ہمیں اس تاریخ کے اُن خطوط کے مندرجات کے ساتھ تطابق کا ثبوت میسر آتا ہے کیوں کہ جنابِ اقبال ستمبر ۱۹۰۷ء میں واقعی ہائیڈل برگ میں موجود تھے۔

اسی طرح ص ۳۰۲ پر دی گئی نظم 'شعاعِ آفتاب' کے اوپر شیخ صاحب نے یہ شذرہ تحریر کیا ہے (یہ نظم بھی روز گار فقیر میں شامل نہیں ہے):

یہ نظم ڈاکٹر صاحب نے ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء کے عظیم الشان مشاعرے (متعلق بہ خاتمۂ جنگِ عظیم اوّل) منعقدہ بریڈلا ہال میں زیرِ صدارت آنریبل نواب ذوالفقار علی خاں پڑھی جس وقت ہز آنر سر مائیکل اوڈوائر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب بھی موجود تھے۔ کئی ہزار کا مجمع تھا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ نوٹ اور مطبوعات میں بھی موجود ہو۔ بہرحال، اس نظم کی پیشانی پر بھی شیخ صاحب نے اضافہ کیا ہے کہ ''✓ سرودِ رفتہ میں ہیں۔ باقی بانگِ درا۔'' یہ نظم اسی عنوان (شعاعِ آفتاب) کے تحت بانگِ درا میں موجود ہے (صبح جب میری نگہ سودائیِ نظارہ تھی....الخ) اس نظم کے دوسرے بند کا شعر سوم شیخ صاحب نے دو صورتوں میں دیا ہے یعنی اولاً بیاض میں یوں تحریر کیا ہے:

میں کوئی بجلی نہیں، فطرت میں گو ناری ہوں میں

مہرِ عالم تاب کا پیغامِ بیداری ہوں میں

پھر پہلے الفاظ کے اوپر وہ version دیا ہے جو بانگِ درا میں ہے یعنی ''برقِ آتش خو نہیں'' (فطرت میں گو ناری ہوں میں)۔ علاوہ ازیں بیاض میں اس نظم کا آخری شعر اولاً یوں تھا، جو بانگِ درا میں

حذف کردیا گیا ہے۔(شیخ صاحب نے اس کے پہلو میں ✓ کا نشان لگایا ہے):

کند تلواریں ہوئیں عہدِ زرہ پوشی گیا
جاگ اُٹھ تو بھی کہ وقتِ خود فراموشی گیا

اور پھر اس کے بائیں ہاتھ اُس شعر کا اضافہ کردیا ہے جو مندرجہ بالا شعر کے بجائے اب بانگِ درا میں اس نظم کا مقطع ہے یعنی:

تیرے مستوں میں کوئی جویائے ہشیاری بھی ہے
سونے والوں میں کسی کو ذوقِ بیداری بھی ہے

پھر بیاض کے ص ۲۳۴-۲۳۵ پر جو نظم 'ترانہ' کے عنوان سے درج ہے (اور بانگِ درا میں 'میں اور تو' کے عنوان سے) یعنی: نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا....الخ۔ اس کے آخر میں شیخ صاحب نے تحریر کیا ہے: ''(مارچ ۱۹۱۸ء) انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جلسہ منعقدہ ۱۹۱۸ء میں ایک کثیر مجمع کے سامنے زیرِ صدارت نواب صاحب کرنال پڑھی گئی۔ حاضرین تڑپ اُٹھے۔'' نظم میں شیخ صاحب نے چار عدد پاورقی حاشیے بھی دیے ہیں یعنی: (پلاس[1]): [1] بوریا۔ (ابوذری[2]): [2] حضرت ابوذر غفاری، صحابیِ رسول ﷺ۔ (نوٹ: یہ شعر بانگِ درا میں نہیں ہے یعنی:

جو ترے غرورِ بلند پر ہے نوا کا بولبھی اثر
ترے ہر بیاں سے عزیز تر ہے مجھے پلاس[1] ابو ذری[2]

اس شعر کے پہلو میں شیخ صاحب نے (?) کا نشان لگایا ہے۔ پھر (مرحبی[3]): یہودی (غزوۂ خیبر) (عنتری): [4] عنتر۔ بانگِ درا میں یہ حاشیے نہیں ہیں۔

اسی طرح بیاض کے ص ۲۲۰ پر 'چاند' نامی نظم درج ہے جس کے بارے میں دو ایک باتوں کا بیان شاید خالی از دلچسپی نہ ہو۔ یہاں پہلا شعر بیاض میں یوں ہے:

اے چاند حُسن تیرا گردوں کی آبرو ہے
تو پھول ہے کنول کا مہتاب تیری بو ہے

پھر شیخ صاحب نے 'گردوں' کا لفظ کاٹ کر اس کے اوپر 'فطرت' لکھ دیا ہے اور مصرعِ ثانی کو کاٹ کر اس کے اوپر لکھا ہے: 'طوفِ حریم خاکی تیری قدیم خو ہے۔' اور یوں انھوں نے یہ شعر بانگِ درا میں اسی عنوان کے تحت مطبوعہ نظم کے مطابق کردیا ہے لیکن بیاض میں اس نظم کے نیچے انھوں نے جو الفاظ تحریر کیے ہیں وہ بانگِ درا میں موجود نہیں ہیں یعنی: ''شاہدرہ لاہور۔ ۱۳/ اپریل ۱۹۱۱ء ۱۱ بجے شب۔'' یہ ایک دلچسپ انکشاف ہے۔ صفحہ ۲۹۷ پر شیخ صاحب نے عنوان دیا ہے نانک رحمتہ اللہ علیہ (میری معلومات کے مطابق احمدیت میں سکھوں کے گوروؤں اور بالخصوص گورونانک جی کی تعظیم پر زور دیا جاتا ہے۔ فقیر سیّد وحید الدین صاحب نے اپنی کتاب میں رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ حذف کردیے ہیں۔

اسی طرح میں نے دیکھا ہے کہ بچوں کے لیے بہت سی نظموں کے آخر میں (مثلاً محنت، ماں کا خواب، ایک مکڑا اور مکھی، بچوں کے لیے چند نصیحتیں، گھوڑوں کی مجلس، ہمدردی، شہد کی مکھی) نظموں کے نیچے شیخ صاحب نے لکھا ہے: ''(از ففتھ اردو ریڈر)'' اور ایک مرتبہ یعنی 'شہد کی مکھی' کے تحت: ''(از اردو ففتھ ریڈر)۔'' مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ماخذ ایک نئی دریافت ہے کیوں کہ رفیع الدین ہاشمی صاحب نے بڑی دقتِ نظر سے اقبال (اور حکیم احمد شجاع) کی مرتبہ بچوں کی درسی کتابوں کی جو تفصیل اپنی کتاب تصانیفِ اقبال کا تحقیقی توضیحی مطالعہ میں دی ہے، اُس میں یہ حوالہ بظاہر موجود نہیں ہے۔ کتاب مذکور کے صفحات ۴۲۴ تا ۴۳۰ (اور ضمیمہ ۱، ص ۴۰ تا ۴۲) میں ہاشمی صاحب نے پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے لیے اُردو کورس کی درسی کتابوں کی تفصیلات درج کی ہیں۔ وہاں انھوں نے 'سلسلۂ ادبیہ... اردو کورس پانچویں جماعت کے لیۓ' کے صفحۂ عنوان یا سرورق کی عکسی نقل بھی شامل کی ہے لیکن ص ۴۲۹ پر وہ فرماتے ہیں کہ ''علامہ اقبال کی کوئی نظم (اس کتاب میں) شامل نہیں۔ چنانچہ لازم ہے کہ شیخ صاحب نے جس کتاب (ففتھ اردو ریڈر) سے بچوں کی یہ نظمیں اخذ کی ہیں وہ درسی کتابوں کے کسی اور سلسلے سے تعلق رکھتا ہے۔ برسبیلِ تذکرہ، 'محنت' نامی نظم (ص ۳۲۷-۳۲۶) میں ایک پاورقی نوٹ بھی ہے (جو روز گار فقیر میں حذف کر دیا گیا ہے) یعنی: Columbus, the founder of the new world[۱] اور یہ حوالہ اس شعر کی طرف ہے:

گڈریوں کو شاہنشہی اُس نے دی ہے
کولمبس کو دنیا نئی اُس نے دی ہے

اگرچہ discoverer of the new world ہونا چاہیے تھا۔

یہ مضمون یا دیباچہ کافی طویل ہوگیا ہے لیکن اس کے خاتمے سے قبل میں چند ایک متفرق موضوعات پر مختصر باتیں کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

۱۔ اوّل بات یہ ہے کہ شیخ صاحب قبلہ نے اس بیاض میں علامہ کا جو کلام جمع اور قلم بند کیا ہے وہ کسی خاص تاریخی ترتیب (chronological order) سے درج نہیں کیا گیا بلکہ اس میں بے پناہ تاریخی بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ بہت سا ابتدائی کلام آخر میں ہے اور پختہ کلام شروع میں اور وہ بھی بری طرح گڈمڈ ہے۔ مزید برآں اگرچہ یہ تو صاحبِ روز گار فقیر سے لیے گئے اقتباس سے معلوم ہے (جو اُوپر نقل کیا جاچکا ہے) کہ شیخ صاحب نے علامہ کا کلام ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ جمع کرنا شروع کر دیا تھا (جب ان کی عمر بارہ سال کی تھی) اور اس بیاض میں اُس کی تحریر کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہوا تھا لیکن ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ اندراجات جاری کب تک رہے؟ اس سلسلے میں بیاض میں درج چند تواریخ مدد دیتی ہیں، مثلاً ص ۱۴۱ پر فارسی نظم 'دعا' کے عنوان کے نیچے ہمیں یہ نوٹ نظر آتا ہے: ''۱۹۲۸ء میں دردِ گردہ میں مبتلا ہونے پر۔'' جس کے بعد وہ نظم ہے: دِہ مرا فرصتِ ہوحق دوسہ روزے دگرے....الخ)۔ نظم کے نیچے (حوالۂ

اشاعت کے طور سے) درج ہے: (انقلاب)۔

اس سے دو صفحے پیشتر یعنی ص ۱۳۹ پر ہمیں ایک نظم ملتی ہے جس کا عنوان 'نوائے بے نوا' اور زیریں عنوان 'شبیرؓ و جمال آفرینی' ہے:

بیا تا ازیں انجمن بگذریم
ازیں کاخ و کوئے کہن بگذریم

اس نظم کے پانچویں اور آخری شعر:

اگر بندۂ ایں نوائے زند
چو یزداں جمال آفرینی کند

کے پہلو میں درج ہے: ''روزنامہ انقلاب۔ شبیرؓ نمبر۔'' پھر نظم کے نیچے ایک اور شعر تحریر ہے:

ریگِ عراق منتظر، خاکِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسین باز دِہ کوفہ و شامِ خویش را

(زبورِ عجم کی غزل نمبر ۸ میں یہ شعر چوتھے نمبر پر موجود ہے)۔ اس شعر کے بازو میں شیخ صاحب نے لکھا ہے: ''سرورق'' جس سے غالباً مراد ہے انقلاب کے شبیر نمبر کا سرورق۔ یہاں جس بات کی نشاندہی میں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ چونکہ زبورِ عجم اولاً جون ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی اس لیے یہ اندراج لازماً اُس تاریخ کے بعد کا ہے۔

اسی صفحے (۱۳۹) پر ہمیں شیخ صاحب کا دیا ہوا یہ عنوان نظر آتا ہے: ''(مولانا محمد علی مرحوم کی وفات پر)'' اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی درج ہے کہ "سرودِ رفتہ میں چھپ گئی ہے۔'' یہ وہ قطعہ ہے جس میں وہ یادگار شعر بھی آتا ہے کہ:

خاکِ قدس اُورا بہ آغوشِ تمنا درگرفت
سُوئے گردوں رفت زآں را ہے کہ پیغمبر گذشت

چونکہ ہمیں معلوم ہے کہ مولانا محمد علی جوہر لندن میں پہلی گول میز کانفرنس کے خاتمے سے چند روز پیشتر یعنی ۴؍جنوری ۱۹۳۱ء کو اُسی شہر میں جاں بحق ہوگئے تھے اس لیے ظاہر ہے کہ شیخ صاحب مرحوم و مغفور نے بیاض میں یہ اندراج جنوری ۱۹۳۱ء کے بعد کیا ہوگا (انھوں نے یہ بحوالہ انقلاب نقل کیا ہے)۔ سو، سرسری تلاش کے بعد مجھے اس بیاض میں کلامِ اقبال کا یہی معتد بہ اندراج (یعنی بعد از ۱۹۳۱ء) سب سے آخری (most recent) معلوم ہوا ہے۔ یہ بھی عیاں ہے کہ ۱۹۲۰ء کے عشرے کے بعد تادیر یہ بیاض شیخ صاحب کے پیشِ نظر رہی اور وہ وقتاً فوقتاً اس میں نئے شذرات اور کلام کے تکملات وغیرہ شامل کرتے رہے مثلاً بیاض کے ص ۳۷۵ پر وہ لکھتے ہیں اور نوٹ کیجیے کہ بیاض کے مرکزی حصّے کے نمبر ہائے شمار کے

برخلاف وہ یہ نئے نمبر یعنی 359 تا 376 انگریزی ہندسوں میں درج کرتے ہیں۔ ''متعلق صفحہ ۱۷۸۔۱۷۹ ’بلادِ اسلامیہ‘ حسبِ ذیل بند جو سرودِ رفتہ میں شائع ہوا ہے اس بیاض میں نہیں۔'' (یہ وہ بند ہے جو یوں شروع ہوتا ہے: گو مٹانا بستیوں کا ہے شعارِ روزگار....الخ) اور چونکہ سرودِ رفتہ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی تھی اس لیے ظاہر ہے کہ مندرجۂ بالا اضافہ اُس تاریخ کے بعد کا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ فقیر سیّد وحید الدین نے اپنی کتاب میں شیخ اعجاز احمد صاحب کی بیاض سے جو پیش ازیں غیر مطبوعہ کلام نقل کیا ہے، اُس میں کئی مقامات پر انھوں نے وہ ترتیب باقی نہیں رکھی جو شیخ صاحب کی بیاض میں نظر آتی ہے (گو خود اس کی ترتیب بھی محلِ نظر ہے) لیکن ان تمام تغیرات (variations) کی نشان دہی کے لیے جس جزرسی اور تفحص کی ضرورت ہے اس کے برۂ وافر سے میرے دوست جناب رفیع الدین ہاشمی بخوبی مستفیض ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے مشکل کام میں بخوشی اُن کے سپرد کرتا ہوں۔ ہاں، اس قسم کی تحقیق و پژوہش کے لیے سب سے پہلے جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ بیاض کے مندرجات کی ایک مکمل اور صفحہ وار فہرستِ مطالب تیار کی جائے۔ (کیوں کہ جیسا کہ اس مضمون میں اوپر ذکر ہوا، جناب شیخ صاحب کی تیار کی ہوئی فہرست صرف صفحہ ۱۹ تک جاتی ہے) اور اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ ہر نظم یا غزل کے سامنے بانگِ درا، روز گار فقیر، سرودِ رفتہ اور رختِ سفر وغیرہ میں مطبوعہ کلام کے صفحات نمبر درج کیے جائیں تاکہ ایسے تقابلی جائزے میں سہولت پیدا ہو ورنہ یہ کام بہت گنجلک اور الجھا ہوا ہے۔ مثلاً جیسا کہ ابھی بیان ہوا فقیر صاحب نے بھی روز گار میں اس بیاض سے جو کلام نقل کیا ہے اُس میں مؤخر الذکر کے مندرجات کی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور بہت سی چیزیں مقدم و مؤخر کر دی گئی ہیں۔

اس سلسلے میں صرف ایک دو اضافے شاید باعثِ دلچسپی ہوں۔ وہ یہ کہ صاحبِ روز گار فقیر نے بیاض میں جہاں کوئی لفظ غائب (missing) یا غلط (مثلاً خارج از وزن پایا، انھوں نے وہاں اپنی تالیف میں نقطے (.....) لگا دیے ہیں۔ مثال کے طور سے روز گار میں ص ۳۳۹ تا ۳۴۲ پر بیاض سے جو نظم نقل کی گئی ہے (اگرچہ سیّد صاحب نے کسی وجہ سے اس کا عنوان ’فراق‘ حذف کر دیا ہے جو بیاض میں موجود ہے۔ دیکھیے مؤخر الذکر کا ص ۲۵۵)۔ اُس میں ’روز گار‘ کے ص ۳۴۰ پر تیسرا مصرع فقیر سیّد وحید الدین صاحب نے یوں تحریر کیا ہے: ''نجاتِ سنگ ہے سرگشتگی....کی'' چونکہ بیاض کے ص ۲۵۶ پر یہ درمیان کا لفظ غائب ہے۔ (برسرِ تذکرہ، اس سے قبل کے شعر میں کاتب نے غلطی سے روز گار میں ''اگرچہ سب سے برا ہوں میں جانثاروں میں'' لکھ دیا ہے جب کہ بیاض میں ''جاں نثاروں میں'' صحیح طور سے تحریر ہے) لیکن اس بند کا آخری شعر سیّد صاحب نے یوں تحریر کیا ہے:

به لب ز دردِ تو آہے کہ داشتم دارم
... سرِ راہے کہ داشتم دارم

جب کہ بیاض میں شیخ صاحب نے مصرعِ دوم یوں درج کیا تھا:

تشتنے سرِ راہے کہ داشتم دارم

لیکن یہاں اس مصرعے کا پہلا لفظ یا تو بے معنی یا خارج از وزن نظر آتا ہے۔ برسرِ تذکرہ، اس نظم کے اوپر شیخ صاحب نے موٹی سرخ پنسل سے یہ نشان ثبت کیا ہے: ✕

دوسرا اضافہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ بیاض کے ص ۲۹۱ سے متعلق ہے یعنی نظم معنونہ 'پیش کش بہ.....' جو یوں شروع ہوتی ہے:

نغمۂ رنگیں سمجھ یا نالۂ پیہم سمجھ
اس نوا کو یا نوائے بربطِ عالم سمجھ

(اس نظم پر بھی موٹی سرخ پنسل والا نشان ✕ ثبت ہے۔) قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہاں چوتھے شعر کے مصرعِ اوّل کا آخری لفظ غائب تھا یعنی یہ شعر بیاض میں یوں مرقوم تھا:

خندہ ہے بہرِ طلسمِ غنچۂ تمہید
تو تبسم سے مری کلیوں کو نا محرم سمجھ

لیکن سیّد صاحب نے بجائے اس کے کہ خالی جگہ میں وہ نقطے (.....) لگاتے انھوں نے روز گار میں (ص ۳۴۴-۳۴۵ پر) یہ سارا شعر ہی حذف کر دیا ہے اور اسی نظم میں آگے چل کر (مقطع سے دو شعر قبل) جہاں بیاض میں اس شعر کا مصرعِ ثانی غائب تھا یعنی: ''آہ! خود پیدا کیا ناداں نے سامانِ فراق [مصرعِ ثانی ناموجود]'' روز گار میں ص ۳۴۶ پر یہ سارا شعر ہی حذف کر دیا ہے جس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔

تیسری بات جو متفرقات کے تحت میں کہنے کی اجازت چاہتا ہوں، وہ دو ایک تسامحات کے بارے میں ہے۔ پہلا تسامح علامہ کی مشہور نظم 'فلسفۂ غم' (میاں فضل حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا لاہور کے نام) مطبوعہ بانگِ درا (اقبال اکادمی پاکستان کی کلیات (۱۹۹۰ء) ص ۱۸۲) سے متعلق ہے۔ معاملہ یوں ہے کہ بیاض کے ص ۲۰۸ پر شیخ صاحب نے تحریر کیا ہے: فلسفۂ غم (آنریبل خان بہادر میاں فضل حسین صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا) (کے والدِ بزرگوار کی وفاتِ حسرت آیات) (پر لکھی گئی)۔ (تشریح۔ شیخ صاحب کا یہ ذیلی عنوان تین سطور پر محیط ہے اور ہر لائن پر الگ بریکٹ لگائی گئی ہے۔ نظم کے نیچے شیخ صاحب نے لکھا ہے: ''مخزن (جولائی ۱۹۱۰ء' پھر مولوی عبدالرزاق کی کلیات میں صفحہ ۱۰۳ پر 'غم' کے ماتحت ہمیں یہ مفصل نوٹ نظر آتا ہے: ''شاعر نے یہ فلسفیانہ رنگ کی نظم اپنے قدیم اور ہم جماعت دوست میاں فضل حسین صاحب ایم اے ایل ایل بی بیرسٹر ایٹ لا کو (جو ۱۹۲۱ء) میں صوبہ پنجاب کی جدید کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تھے اور آج کل اسی کونسل میں وزیرِ تعلیم ہیں) اُن کی والدہ (پھر کتاب کے صحت نامے میں ص ۳ پر اس کی یوں تصحیح کی گئی: ان کے والد) کی رحلت کے المناک موقع پر غم غلط کرنے کے لیے لکھ کر بھیجی تھی۔ اس میں جس خوبی سے بقا و فنا اور فلسفۂ غم کے نازک مسئلہ کو حل کیا گیا ہے، اربابِ ذوقِ سلیم ہی

بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔"

میں نے کلیات کے اُس نسخے پر، جو میرے کرم فرمائے مرحوم جناب میر یٰسین علی خاں صاحب نے مجھے عطا کیا تھا، مورخہ ۲۱/ مئی ۱۹۹۸ء کو ص ۱۰۳ پر والد (ہ) کے بالمقابل حاشیے میں یوں تحریر کیا ہے: "بیٹے! میاں عظیم حسین، فرزندِ میاں فضل حسین نے تصدیق کی (ہے) کہ یہ اُن کے بڑے بھائی کی وفات سے متعلق ہے۔" راقم کو یہ معلوم نہیں کہ مخزن کے شمارے بابت جولائی ۱۹۱۰ء میں کیا لکھا گیا ہے اور کس وجہ سے یہ خلطِ مبحث (confusion) پیدا ہوگیا ہے۔ برسرِ تذکرہ میں یہ اضافہ کردوں کہ لندن میں مقیم جناب عظیم حسین صاحب نے جن سے راقم الحروف کو شرفِ نیاز حاصل ہے، بروز ۱۵/ دسمبر ۱۹۹۲ء مجھے علامہ کی کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam (مطبوعہ لندن ۱۹۳۴ء) کا ایک بے بہا نسخہ عطا کیا تھا، جو علامہ نے اُن کے والدِ مرحوم کو ان انتسابی الفاظ کے ساتھ پیش کیا تھا:

With complements from
Muhammad Iqbal
16th May 1934
Lahore.

(نوٹ: compliments کے ہجوں میں تسامح، ایسے معاملوں میں علامہ کی معروف بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ علامہ کی کتاب کا یہ نسخہ بھی میں اقبال اکادمی پاکستان کے ذخیرۂ محفوظ Archives میں داخل کردوں جہاں پچھلے دو تین برس میں، میں نے کئی ایک اور ایسی نادر اشیا جمع کی ہیں۔

دوسرا تسامح یا تضادِ رائے (controversy) جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، وہ "سرودِ رفتہ" کی ترکیب (phrase or expression) سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے کرنل فقیر سیّد وحید الدین صاحب نے روز گار فقیر (جلد دوم، مطبوعہ نومبر ۱۹۶۴ء و اگست ۱۹۶۵ء) میں صفحات ۱۷، ۱۸ پر ایک بہت بڑے شاخسانے یا مناقشے کے طور سے اجاگر کیا ہے۔ پہلے تو فقیر صاحب نے ص ۱۷ پر ایک جلی عنوان جمایا ہے سرودِ رفتہ اور اس کے نیچے علامہ کا مشہور فارسی قطعہ درج کیا ہے جو انھوں نے یوں تحریر کیا ہے:

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگرد دانائے راز آید کہ ناید

(میرے خیال میں یہاں "روزگارِ ایں فقیرے" ہونا چاہیے) بہرحال اس کے نیچے انھوں نے بڑی تفصیل سے یہ بیان کیا ہے کہ کس طرح علامہ کے جنازے کے جلوس میں کسی شخص نے یہ قطعہ چھپوا کر تقسیم کیا "جس میں سرودِ رفتہ" املا کیا گیا تھا....."اس غلطی پر ارمغان حجاز کی اشاعت نے مہرِ تصدیق ثبت کردی....." روز گارِ فقیر کے نقشِ ثانی کے منظرِ عام پر آنے سے کچھ پہلے حکیم الامت کے فرزند ڈاکٹر

جاوید اقبال نے اس غلط فہمی کی وضاحت کی۔ انھوں نے کہا کہ ارمغان حجاز کا ساتواں ایڈیشن جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا ہے، اُس کے صفحہ ۱۴ پر اس افسوس ناک غلطی کی تصحیح کر دی گئی ہے، لہٰذا روز گارِ فقیر میں بھی اس قطعے کو ''سرودِ رفتہ'' کے ساتھ ہی چھپنا چاہیے۔''

میں نے اپنے ذاتی نسخۂ روز گار میں بروز ۲/ دسمبر ۱۹۸۵ء ایک پاورقی حاشیہ لکھا ہے کہ: ''مگر جناب غلام رسول مہر نے اپنے ایک مضمون میں مدلّل اصرار کیا ہے کہ 'سرودِ رفتہ' ہی صحیح ہے۔'' میں نے یہاں یہ تمام قضیہ اس لیے بیان کیا ہے کہ جب میں شیخ اعجاز احمد صاحب کی بیاض کی ورق گردانی کر رہا تھا تو وہاں ص ۱۸۰ پر (نظم معنونہ 'مسلم'، کا) تیسرا شعر یہ نظر آیا:

گوش آوازِ سرودِ رفتہ کا جویا ترا
اور دل ہنگامۂ حاضر سے بے پروا ترا

بلکہ یہی شعر بانگِ درا (مطبوعہ اقبال اکادمی کلیات ص ۲۲۳) پر 'مسلم' (جون ۱۹۱۲ء) کے تحت بعینہٖ اسی صورت میں درج ہے۔ (میرے خیال میں علامہ نے شاید ورڈز ورتھ وغیرہ کے الفاظ A bygone melodey سے متاثر ہو کر یہ ترکیب وضع کی ہو) بلکہ اب تو اقبال اکادمی پاکستان کی مطبوعہ کلیاتِ اقبال، فارسی (لاہور۔ ۱۹۹۰ء میں ص ۷۷۵ پر بھی (ارمغان میں) اس قطعے میں یہی ترکیب، یعنی ''سرودِ رفتہ'' موجود ہے۔ اور اسی پر بس نہیں، خود ڈاکٹر جاوید اقبال کی نشر کردہ کلیاتِ اقبال، فارسی (شیخ غلام علی لاہور ۱۹۷۳ء) میں ص ۸۹۴ پر 'سرودِ رفتہ' ہی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ چنانچہ، بقول غالبؔ:

پھر یہ ہنگامہ اے خدا، کیا ہے؟

اِس طویل تمہید کے بعد میں آپ کے اور اس بے بدل مجموعۂ کلام یعنی بیاض اقبال جمع آوردۂ جناب شیخ اعجاز احمد مرحوم، کے درمیان مزید حائل نہیں ہونا چاہتا۔ اس بیاض کی تنظیم و تہذیب و اشاعت کے بعد آپ علامہ کا بہت سا ایسا کلام جو اُن کی منظور شدہ (authorized) تصانیف میں موجود نہیں، ایک ہی کتاب میں یک جا ملاحظہ کر سکیں گے، بجائے اس کے کہ اُسے باقیات، اور کُلیات عبدالرزاق، اور رختِ سفر اور سرودِ رفتہ، اور روز گارِ فقیر میں ڈھونڈیں اور الگ الگ کڑیاں آپس میں جوڑیں، کہ اِس وقت، بقولِ اقبال حالت یہ ہے کہ:

اُٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

تو تمنّا، چمنستانِ اقبال کے اِس حقیر رکھوالے کی یہ ہے کہ گلشنِ اقبال کے یہ تمام پھول بوٹے، کہ ایک سرمایۂ بہارِ بے خزاں ہیں، مداحینِ اقبال کے لیے بہ یک جا نظر نواز ہو سکیں۔

بندۂ فانی۔ سعید اختر دُرّانی
برمنگھم، ۴/ جون ۲۰۰۵ء

پسِ تحریر

بدھ ۸/جون ۲۰۰۵ء کے روز ہماری اقبال اکیڈیمی (برطانیہ) کا سالانہ اقبال لیکچر بہ عنوان Iqbal as a Bridge Between Civilizations (اقبال: تہذیبوں کے درمیان ایک پل) برمنگھم کی تاریخی عمارت Birmingham & Midland Institute میں جس کا سنگِ بنیاد ملکہ وکٹوریہ کے شوہر پرنس البرٹ نے ۱۸۵۴ء میں رکھا تھا، منعقد ہوا۔ یہ لیکچر اقبال اکادمی پاکستان کے ناظم جنابِ محمد سہیل عمر نے صادر فرمایا۔ لیکچر کے خاتمے پر، اس بے مثل بیاضِ اقبال کا تاریخی پس منظر مختصراً بیان کرنے کے بعد، راقم الحروف نے یہ بیاض جناب سہیل عمر کو اس استدعا کے ساتھ پیش کی کہ وہ اس کی تنظیم وتہذیب اور شیرازہ بندی کے بعد اسے اپنی اکادمی کے یہاں سے شایانِ شان طریقے سے شائع فرمائیں اور بعدازاں اسے اقبال اکادمی پاکستان کے حفاظت خانے میں محفوظ کرلیں۔ جہاں میں پچھلے سال میں اپنی اور اقبال اکیڈیمی برطانیہ کی جانب سے چند اور کتابیں اور نوادراتِ اقبال جمع کر چکا ہوں۔ اس طرح شیخ اعجاز احمد مرحوم کی خواہش اور وصیت پوری ہو سکے گی۔

جنابِ سہیل عمر نے برسرِ عام راقم الحروف کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ وہ بہ صمیمِ قلب وعدہ کرتے ہیں کہ حسبِ استدعا وہ بڑی مسرت اور امتنان کے ساتھ اس تاریخی بیاض کو اقبال اکادمی پاکستان کی جانب سے شائع بھی کریں گے اور اس کے بعد اسے اکادمی کے محافظ خانے میں محفوظ بھی کر دیں گے۔ اس پر بڑے جوش وخروش سے تالیاں بجیں اور اس عملِ پیشکش وتحویل (presentation) کو ٹیلی وژن اور اخبارات کے رپورٹروں نے تصویری coverage (احاطگی) بھی دی۔

اس مضمون میں ایک آخری اضافہ کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ مذکورہ لیکچر سے ایک روز پہلے جب میں نے سہیل عمر صاحب کو یہ بیاضِ اقبال دکھائی تو وہ بہت متعجب ہوئے کہ یہ نادر چیز یہاں برمنگھم کیسے پہنچ گئی؟ جس پر میں نے اس کے حصول کا پس منظر بتایا جو اوپر بالتفصیل بیان ہو چکا ہے۔ دورانِ گفتگو سہیل عمر صاحب نے دو اور باتوں کا بھی ذکر کیا۔ اوّل یہ کہ جہاں تک اُن کی تحقیقات کا تعلق ہے، وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقبال کے برادرِ بزرگ جناب شیخ عطا محمد صاحب احمدیت سے بیعت نہیں تھے۔

دوسری بات جو سہیل صاحب نے بتائی، وہ یہ تھی کہ معروف محققِ اقبالیات جناب پروفیسر صابر کلوروی نے ماضی قریب میں ایک کتاب معنونہ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال شائع کر دی ہے۔ اس اطلاع سے نہ صرف میری معلومات میں اضافہ ہوا بلکہ اس پیش رفت پر خوشی بھی ہوئی کیوں کہ یہ کام واقعی کرنے کا تھا اور اس کے لیے کلوروی صاحب بہت موزوں شخص ہیں۔ بہ ہر حال میری دانست میں شیخ اعجاز احمد صاحب کی بیاض کی facsimile (عکسی نقل) اشاعت کی اہمیت مذکورہ کلیات کی اشاعت سے کم نہیں ہوتی چونکہ

ایک بنیادی ماخذ (primary source) کے لحاظ سے اس کا اپنا مقام اور تاریخی افادیت بہرکیف موجود رہے گی۔ چنانچہ مجھے خوشی ہوئی کہ جناب سہیل عمر نے برسرِ عام اس بیاض کی اشاعت کی ہامی بھر لی ہے اور میری تمنا ہے کہ میرا یہ دیباچہ بھی اس مطبوعہ کتاب میں شامل ہوتا کہ قارئین اس بیاض کے تاریخی پس منظر سے آگاہ ہو سکیں۔

دُرّانی

برمنگھم ۳۰/جون ۲۰۰۵ء